خودشناسی ذریعہ ہے خداشناسی کا

رئیس العلماء آیۃ اللہ سید کاظم نقوی، سابق ڈین آف تھیالوجی ڈپارٹمنٹ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ہماری زندگی کے نیچرل اسباب وجود خدا کی دلیل ہیں

زندگی کی حقیقت کے سلسلے میں اختلاف ہے۔ مادیین زندگی کو مادے کی ہم آہنگی کا کیمیائی (CHEMICAL) اثر کہتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں خدا پرست طبقہ اسے جسم اور مادے سے الگ ایک مستقل موجود سمجھتا ہے۔ ان دونوں نظریوں میں سے کون صحیح اور کون غلط ہے؟ ہمیں اس وقت اس سے مطلب نہیں ہے۔ بہرحال یہ بات دونوں طبقے مانتے ہیں کہ کرۂ زمین یا دوسرے کروں میں جاندار چیزوں کے وجود میں آنے کے لئے بہت سی شرطوں کی ضرورت ہے، بغیر ان کے اکٹھا ہوئے زندگی کا وجود میں آنا غیر ممکن ہے۔ یہ کہنا کہ ایسا ہوسکتا ہے کہ شرائط حیات خود بخود جمع ہوجائیں اور زندگی کو وجود میں لے آئیں انتہائی عجیب وغریب ہے۔ ان کے اتفاقاً اکٹھا ہوجانے کا احتمال اتنا کمزور ہے جو صفر کے برابر کہا جاسکتا ہے۔

جب کسی چیز کی پیدائش کے دس سبب ہوں تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ان دسوں کا مجموعہ اس کے وجود کی علت (CAUSE) ہے۔ ان میں سے فرداً فرداً ہر ایک اس مجموعہ کا جز ہے۔ ان میں سے اگر کوئی سبب بھی نہ ہوتو وہ چیز وجود میں نہیں آسکے گی۔ اس کرۂ زمین پر زندگی کے وجود میں آنے کے لئے اتنے شرائط، حالات اور اسباب کی ضرورت ہے جنہیں آدمی نہیں جان سکتا۔ نمونے کے طور پر ان میں سے چند شرطوں کا ذکر کیا جاتا ہے:۔

۱۔ کرۂ زمین کی فضا پر مختلف قسم کی گیسیں چھائی ہوئی ہیں جن کی موٹائی آٹھ سو کلومیٹر بتائی جاتی ہے۔ سائنسداں یہ بھی کہتے ہیں کہ روزانہ بیس ملین دیوپیکر پتھروں کا رخ زمین کی طرف ہوتا ہے اور وہ اس سے ٹکر لینا چاہتے ہیں۔ ان کی رفتار ایک سیکنڈ میں پچاس کلومیٹر بتائی گئی ہے۔ یہ طرح طرح کی گیسیں کرۂ زمین کے لئے ایک مضبوط اور پائیدار زرہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ اس کے باشندوں کو ان بیس ملین آسمانی چٹانوں کے شر سے بچاتی ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ کرۂ زمین کو ہوا گھیرے ہوئے ہے۔ اس میں ایک خاص درجہ کی رقت (DILUTE) اور لطافت پائی جاتی ہے۔ اگر وہ زیادہ لطیف اور رقیق ہوتی تو اس کا خطرناک نتیجہ یہ تھا کہ ہمیشہ شہاب ثاقب (SHOOTING STARS) زمین سے ٹکراتے رہتے اور اس میں تباہیاں مچتی رہتیں، لیکن وہ کرۂ زمین تک نہیں پہنچتے، اس پر چھائی ہوئی ہوا سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہوجاتے ہیں۔

شہاب ثاقب کی رفتار بھی مناسب ہے۔ وہ کم سے کم چھ میل اور زیادہ سے زیادہ چالیس میل ایک سیکنڈ میں طے کرتے ہیں، وہ جس چیز سے بھی ٹکراتے ایک دھماکہ پیدا کردیتے اور آگ لگادیتے ہیں۔ اگر ان کی رفتار ایک سیکنڈ میں چھ میل سے کم ہوتی تو وہ ہمیشہ کرۂ زمین تک پہنچ کر اسے تباہ کرتے رہتے۔

کرۂ زمین کے گرد پھیلی ہوئی گیسوں کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ زمین کے درجۂ حرارت کو معتدل بنائے رکھتی ہیں انہی کے طفیل میں اس پر جانداروں کا زندگی بسر کرنا ممکن ہے۔

۲۔روئے زمین پر زندگی کے وجود کا ایک انتہائی اہم سبب پانی ہے۔ جاڑے کے موسم میں سمندروں، نہروں اوردریاؤں کے باقی رہنے کے لئے پانی میں یہ خاصیت رکھ دی گئی ہے کہ وہ درجۂ حرارت کے صفر تک پہنچتے ہی جم جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پانی کے اندر جو گرمی موجود ہے، وہ باہر نہیں نکل پاتی، اس کی سطح پر جمی ہوئی برف رکاوٹ بن جاتی ہے۔ سمندروں، دریاؤں اور نہروں کی تہہ میں بہتا ہوا پانی محفوظ رہتاہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کڑاکے کے جاڑوں میں اپنے ضروریات پورا کرنے کے لئے پانی نصیب نہ ہوتا، تمام سمندر اور دریا بالکل جم جاتے۔ اس کے علاوہ چونکہ برف کا مخصوص وزن پانی کے وزن سے کم ہے وہ پانی سے ہلکی ہے اس بنا پر وہ پانی کی سطح پر رہ جاتی ہے، اس کے نیچے نہیں جاتی ہے، ورنہ تمام سمندر اور دریا جاڑے میں برف سے بھرے نظر آتے، اوپر بھی برف اوران کے اندر بھی برف ہی برف۔

پانی کی طرح مٹی بھی سرمایۂ زندگی ہے، اس میں ایسے خاص معدنی مادے پائے جاتے ہیں، جنہیں پودے جذب کرتے اور ایسی صورتوں میں تبدیل کردیتے ہیں جو جانوروں کی غذا ہیں، لیکن زمین کے اندر مختلف قسم کی دھاتوں کی وجہ سے انسانی تہذیب وتمدن کی ایسی ایسی دل کش صورتیں دنیا کے سامنے آتی رہی ہیں جیسی اس مشینی تہذیب وتمدن کو نصیب نہیں ہوسکتی۔

۴۔کرۂ زمین کا قطر(DIAMETER) بھی مختلف ہے اور اس کی قوت جاذبہ بھی۔ اگر اس کا قطر چاند کے برابر، موجودہ قطر کا ایک چوتھائی ہوتا تو اس کی قوت جاذبہ اتنی کم ہوتی کہ وہ پانی اور ہوا کو اپنی سطح پر روکے نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کا درجۂ حرارت اتنا بڑھ جاتا کہ کوئی جاندار اس پر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اگر زمین کا فاصلہ سورج سے موجودہ فاصلے کا دونا ہوتا تو سورج سے جو گرمی اسے پہنچتی وہ موجودہ مقدار کی چوتھائی ہوتی، سردی کا زمانہ بڑھ کر دونا ہوجاتا اور تمام جاندار برف کی صورت میں جم جاتے۔

سورج زمین سے ۱۵۰ کلومیٹر (یعنی ۱۵ر کروڑ کلو میٹر) دور ہے۔ اگر یہ فاصلہ گھٹ کر آدھے تک پہنچ جاتا تو گرمی کی مدت موجودہ مدت کی چوگنی اور جاڑے کا وقفہ گھٹ کر آدھا رہ جاتا، زمین اتنی گرم ہوجاتی کہ اس پر زندگی بسر کرنا غیر ممکن ہوجاتا۔

کرۂ زمین چوبیس گھنٹے میں ایک بار اپنے محور(AXIS) پر گردش کرتا ہے۔ اس کی رفتار ایک ہزار میل فی گھنٹہ ہے۔ اگر وہ اس کے بجائے ہر گھنٹے میں ایک سومیل طے کرتی تو دن اور رات کی مقدار موجودہ مقدار کی دس گنی ہوجاتی، گرمی کے موسم کا تپتا ہوا آفتاب تمام پودوں کو لمبے لمبے دنوں میں جلا ڈالتا اور لمبی لمبی راتوں کی سردی ننھے ننھے اکھوؤں کو جما کر نیست ونابود کردیتی۔

سورج کے زمین پر تپنے کی ایک خاص مقدار ہے۔ وہ اگر گھٹ کر نصف تک پہنچ جائے تو تمام جاندار سردی کے زیادہ ہونے کی وجہ سے ہلاک ہوجائیں گے۔ یونہی اگر اس کی مقدار دونی ہوجائے تو بھی روئے زمین پر زندگی کا نام ونشان باقی نہیں رہے گا۔

اگر زمین کا چاند سے فاصلہ گھٹ کر پچاس ہزار میل رہ جائے تو سمندروں کے اتار چڑھاؤ میں اتنی زیادتی ہوجائے کہ زمین کے پانچوں براعظم(CONTINENT) کے بیابانوں پر دن میں دو مرتبہ پانی چھا جائے، اس کا ایسا زور ہو کہ بڑے بڑے سربفلک پہاڑوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالے، پانچوں براعظم میں سے کوئی پانی سے باہر نہ آئے، ان انقلابات اور تبدیلیوں کی وجہ سے زمین ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے۔

اگر زمین کے ان براعظموں پر پانی چھا جائے تو اس کی گہرائی تقریباً ڈیڑھ میل سے کم نہ ہوگی۔ ایسی صورت میں کسی طرح روئے زمین پر زندہ رہنا ممکن نہ ہوگا۔ ہاں صرف وہ دریائی جانور زندہ رہ سکیں گے جو اس گہرے پانی میں زندگی بسر کرسکتے ہوں، لیکن وہ بھی ایک دوسرے کو اپنا لقمہ بنا کر ایک

عرصہ کے بعد نیست و نابود ہو جائیں گے۔

۵۔ کرۂ زمین کے گردو پیش کی فضا اتنی موٹی ہے کہ وہ سورج کی تپش کو اسی حد کے اندر زمین تک پہنچنے دیتی ہے جتنی پودوں کی نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ مدتوں سے زمین کی گہرائیوں سے مختلف قسم کے بخارات نکل کر فضاؤں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر زہریلی گیسیں ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ ایسی آلودہ نہیں ہیں کہ ان میں زندگی بسر کرنا ممکن نہ ہو، اب بھی وہ متوازن اور معتدل ہیں۔

جو ہوا سانس لینے کی وجہ سے نتھنوں کے راستے سے ہمارے پھیپھڑوں میں پہنچتی ہے، وہ مختلف قسم کی گیسوں سے ملی جلی ہے۔ اس کی تشکیل ۷۸ فیصدی نائیٹروجن اور ۲۱ فیصدی آکسیجن سے ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ ایک فیصدی دوسری گیسیں ہیں۔ اگر آکسیجن کی مقدار ۲۱ فیصدی کے بجائے ۵۰ فیصدی ہوتی تو اس کرۂ زمین کی ان تمام چیزوں میں آگ لگ جاتی جن میں جلنے کی صلاحیت ہے۔ اگر اتفاق سے بجلی کسی درخت سے چھو جاتی تو اس کی وجہ سے وہ اکیلا درخت نہیں، پورا جنگل آتش بداماں ہو جاتا، وہ دفعتاً بھڑک اٹھتا اور جل کر راکھ ہو جاتا۔

آیا ان نازک اور انتہائی باریک حسابات کے باوجود کہ جن کی طرف اشارہ کیا گیا کوئی عقل مند یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اندھے، بہرے اور ناسمجھ اتفاقات کا نتیجہ ہیں؟ آیا یہ اسی مادے کی کرشمہ سازیاں ہیں جو خود پھٹ گیا اور اس نے طرح طرح کی صورتیں اختیار کرلیں؟ آیا یہ کہنا انصاف کا خون کرنا نہیں ہے کہ یہ حالات اور دوسرے شرائط کہ جن پر زندگی کا دارومدار ہے بغیر صاحب عقل وارادہ ہستی کی مداخلت کے خود بخود اکٹھا ہو گئے ہیں؟ یہ بات کوئی شخص کیسے کہہ سکتا ہے، جب کہ حساب احتمالات (PROBABILITY) جس کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے اس کے خلاف صف آرا ہے۔

اس جگہ ممکن ہے کہ یہ خیال پیدا ہو کہ زندگی کے تمام اسباب کا یک بارگی اکٹھا ہو جانا یقینا بہت بعید ہے۔ یہ ہزاروں احتمالات کے مقابلے میں ایک عدد تعمیری احتمال ہے، لیکن ممکن ہے کہ تدریجی اور پے در پے بے شمار دھاکوں کے نتیجہ میں روئے زمین پر رہن سہن اور زندگی بسر کرنے کے احتمال فراہم ہو گئے ہوں۔ دوسری لفظوں میں یوں کہا جائے کہ زندگی کی تمام شرطوں کا دفعتاً جمع ہونا محال ہے، لیکن ان کا ایک طولانی اور غیر محدود زمانے میں اکٹھا ہونا ممکن ہے۔

اس خیال کی کمزوری بہت واضح ہے، کیونکہ منظومۂ شمسی ثوابت وسیارات اور کرۂ زمین کی مختصر عمر اس مفروضے کے مسترد کرنے کے لئے کافی ہے۔ پے در پے اور غیر محدود اتفاقات جو تمام شرائط زندگی کو جمع کر دیں غیر محدود وقت چاہتے ہیں، جب کہ نظام شمسی، سیارات، ثوابت اور سورج کی عمر محدود ہے۔

سائنسدانوں نے ریڈیو ایکٹیو (RADIO-ACTIVE) اجسام کے ذریعہ کرۂ زمین کی عمر کا پتہ چلا لیا ہے۔ یہ اجسام کہا جاتا ہے کہ دوام اور ثبات کی صفت سے محروم ہیں، لیکن ان کی تبدیلی کی رفتار بہت سست ہے۔ بڑی مدت گزرنے کے بعد وہ کسی دوسرے مادے کی صورت میں تبدیل ہوتے ہیں، مثلاً یورینیم (URANIUM) کہ جو ریڈیو ایکٹیو اجسام میں سے ہے، ایک سوملین سال گزرنے کے بعد صرف دو فیصدی لیڈ (LEAD) یعنی سیسہ بن جاتا اور ۹۸ فیصدی خالص یورینیم رہتا ہے۔ یونہی ایک ہزار ملین سال گزرنے کے بعد ۱۴ فیصدی سیسہ بن جاتا اور باقی ماندہ خالص یورینیم کی شکل میں رہتا ہے۔ جب وہ پانچ ہزار ملین سال کا پرانا ہو جاتا تب پچاس فیصدی خالص یورینیم اور پچاس فیصدی لیڈ، یعنی سیسہ بن جاتا ہے۔

سائنسدانوں نے اندازہ کیا ہے کہ اس وقت معدنی پتھروں میں یورینیم کتنی مقدار میں ہے اور لیڈ کتنی مقدار میں ہے۔ اس اندازے سے انہیں پتہ چل گیا ہے کہ کرۂ زمین کے خشک حصے کی کیا عمر ہے۔ مختلف قسم کے پتھروں پر تجربات

کرنے سے سائنسداں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس ہمارے گہوارۂ زندگی کرۂ زمین کو وجود میں آئے ہوئے تین ہزار ملین سال گزرے ہیں۔ اس سائنسی تحقیق کے ساتھ یہ خیال کیوں کر اکٹھا ہوسکتا ہے کہ اس کرۂ زمین پر زندگی بسر کرنے کی شرطیں بے شمار پے در پے اتفاقی دھاکوں کی وجہ سے وجود میں آ گئی ہیں؟

توازن، کنٹرول اور ضروریات کا لحاظ

ہم دیکھ رہے ہیں کہ کائنات عالم کی مختلف چیزوں کے درمیان توازن برقرار ہے، کوئی چیز قابو سے باہر نہیں ہے، موجودات کے ضروریات پورا ہونے کے سامان کی کمی نہیں ہے۔ اگر یہ دنیا درد دکھ سے بھری ہے تو یہیں اس کا درماں بھی موجود ہے۔ کیا توازن، کنٹرول اور ضروریات کے مطابق ان کے پورا ہونے کا سامان موجود ہونا یہ نہیں بتاتا ہے کہ کائنات میں نظم وضبط موجود ہے؟ ذیل میں توازن، کنٹرول اور ضروریات کے مطابق ان کی تکمیل کے سامان کی موجودگی کے چند نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

(الف) جانداروں اور پودوں کی باہمی وابستگی

جانداروں اور پودوں کی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا وجود دوسرے کے وجود پر موقوف ہے۔ جاندار پودوں کے زندہ رہنے کا سامان فراہم کرتے ہیں اور یونہی پودے جانداروں کو نیست ونابود ہونے سے بچاتے ہیں۔

تمام پودوں کی زندگی کا دارومدار کاربن ڈائی اکسائڈ (CARBON DIOXIDE) کے اوپر ہے، جو ہوا میں پایا جاتا ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ سانس لینا انسان اور جانور سے مخصوص ہے۔ گھانس پھونس اور پودے بھی سانس لیتے ہیں۔ درخت کے پتوں کا بھی وہی کام ہے جو انسان کے پھیپھڑوں کا۔ سورج کی گرمی کی مدد سے وہ کاربن ڈائی اکسائڈ کا تجزیہ کرکے اسے دو جزوں پر تقسیم کردیتے ہیں، کاربن اور آکسیجن۔ کاربن پودوں کے اندر رہ جاتا ہے اور آکسیجن کو وہ اگل دیتے ہیں، جو فضا میں پھیل جاتا ہے۔ جس آکسیجن کو ہم لوگ سانس لے لے کر اپنے پھیپھڑوں میں پہنچاتے ہیں اور جس کے بغیر ہم پانچ منٹ بھی مشکل سے زندہ رہ سکتے، یہی ہر وقت پودے اور گھانس پھونس ہم تک پہنچاتے ہیں۔

پودوں کے سراپائے وجود کی تشکیل کاربن اور پانی نے کی ہے۔ جاندار سانس کے ذریعہ کاربن کو اپنے جسم سے خارج کرتے اور پودے آکسیجن کو، اس طرح ان میں سے ہر ایک دوسرے کے زندہ رہنے کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اگر یہ دونوں اپنے اپنے فریضے کو انجام نہ دیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ روئے زمین پر نہ جاندار رہ جائیں گے اور نہ پودے۔

(ب) خرگوشوں نے زندگی دوبھر کردی

جس زمانے میں یورپ سے ہجرت کرکے وہاں کے باشندوں کی پہلی کھیپ آسٹریلیا آئی تو اس نے وہاں جنگلی کتے ڈینگو (DANGO) کے علاوہ کوئی دوسرا جانور نہ پایا۔ ان لوگوں کو خرگوش کے شکار کا شوق تھا۔ ۱۸۵۹ء میں ان میں کا ایک آدمی ۲۴ خرگوش یورپ سے آسٹریلیا لے آیا، لیکن خرگوش کا کوئی قدرتی دشمن نہ تھا، اس لئے ان کی نسل خوب پھلی پھولی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے جزیزے میں ہر طرف خرگوش ہی خرگوش نظر آنے لگے ان کی بھیڑوں کے لئے چراگاہیں نہ رہ گئیں، انہیں سب خرگوش چر گئے۔ شروع شروع انہوں نے کھیتوں کو گھیر کر انہیں خرگوشوں سے بچانا چاہا، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ حکومت نے ان کے شکار کا انعام مقرر کرکے ان کی تعداد کو گھٹانا چاہا، مگر اس کے بعد بھی مقصد پورا نہ ہوا۔

آخر سائنس کی راہنمائی سے ان کے درمیان ایک خاص طرح کے جراثیم چھوڑے گئے، جنہوں نے خرگوشوں کو بیمار کرکے آسٹریلیا کے لوگوں کو ان کے شر سے نجات دی۔ اگر دنیا میں یہ جراثیم نہ ہوں تو خرگوش کی بڑھتی ہوئی تعداد پر قابو نہیں پایا جاسکتا ہے۔

(ج) کیکٹس کا دشمن کیڑا

کچھ عرصہ پہلے آسٹریلیا میں کھیتوں کی حفاظت کے لئے ایک کانٹے دار پودا ان کے گرد بویا کرتے تھے، جس کا نام کیکٹس (CACTUS) ہے۔ چوں کہ اس وقت آسٹریلیا میں کوئی ایسا جانور موجود نہیں تھا، جو اس پودے کو کھائے، اس لئے کیکٹس خوب آزادی سے پھولا پھلا۔ مختصر عرصہ میں اس نے آسٹریلیا کی آراضی کا بہت بڑا حصہ ہتھیا لیا۔ اس سے وہاں کی کھیتی باڑی کو بڑا نقصان پہنچا۔ آسٹریلیا کے باشندوں نے اس پودے پر قابو پانے کی پوری کوشش کی، لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئے، بالآخر انہوں نے ایک کیڑا ڈھونڈ نکالا جس کی غذا اس پودے کے علاوہ کچھ نہ تھی۔ حسن اتفاق سے اس کی نسل کا پھیلانا بھی بہت آسان تھا۔ آسٹریلیا میں اس کیڑے کا جانی دشمن بھی موجود نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کیڑے نے اس پودے پر فتح پائی، اس نے آسٹریلیا کے باشندوں کو اس کے شر سے نجات دے دی۔ لطف یہ کہ اس پودے کا خطرہ دور ہونے کے بعد یہ کیڑا بھی تقریباً ختم ہوگیا۔ اب ان کیڑوں کی تعداد کم ہوگئی ہے، بس وہ اتنی رہ گئی ہے جو کیکٹس کے خطرناک طریقے سے پھلنے پھولنے پر قابو پا سکے۔

(د) وہ جو رگوں سے سانس لیتے ہیں

آدمی کی طرح کیڑے مکوڑوں کے پھیپھڑے نہیں ہیں۔ قدرت کے ہاتھوں نے ان کے جسم میں پائپ کی طرح رگوں کا جال بچھا دیا ہے۔ وہ بجائے پھیپھڑے کے انہی رگوں سے سانس لیتے ہیں۔ قدرت کی یہ عجیب وغریب حکمت دیکھئے کہ کیڑوں کے جسم بڑھتے ہیں، لیکن ان کی مناسبت سے سانس لینے کی نالیاں نہیں بڑھتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی کیڑا چند سینٹی میٹر سے زیادہ نہیں ہوتا ہے۔ کیڑوں کے سانس لینے کا طریقہ کچھ ایسا ہے کہ جو انہیں زیادہ بڑھنے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ اگر یہ رکاوٹ نہ ہوتی تو کرۂ زمین کی حکومت انہی کے ہاتھوں پہنچ جاتی۔ اگر اس طرح کیڑے مکوڑوں کو کنٹرول میں نہ رکھا جاتا تو انسان کے لئے اس روئے زمین پر زندگی بسر کرنا ممکن نہ ہوتا۔ انسان بھلا ان مچھروں، مکھیوں اور ایسے ہی دوسرے جانوروں کا کہاں مقابلہ کرسکتا تھا جو شیر اور چیتے کے برابر ہوں۔

(ہ) درد کے ساتھ درماں بھی ہے

گذشتہ زمانے میں لوگ مسلسل دریائی سفر کرتے اور باسی، سڑی، گلی غذائیں کھانے کی وجہ سے وہ تکلیف دہ جلدی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے تھے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ نارنج اور کھٹا نیبوان بیماریوں میں مفید ہے۔ ظاہر ہے کہ شروع شروع لوگوں کو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ یہ بیماریاں کیوں کر پیدا ہوتی ہیں؟ سب سے پہلے مڈگاسکر میں ایک شخص نے ان بیماریوں کے بنیادی علاج کا انکشاف کیا۔ اتفاق کی خوبی کہ یہ انکشاف عین اس وقت ہوا جب نزدیک تھا کہ تمام ملاح ہلاک ہوجائیں۔

اس میں کیا شک ہے کہ بہت سی بیماریوں کا سبب جسم انسانی میں وٹامن کی کمی ہے۔ آدمی سیکڑوں برس سے اس کرۂ زمین پر زندگی بسر کررہا تھا، لیکن اسے ان وٹامنوں کی خبر نہ تھی، جو اس کی زندگی کا سرچشمہ ہیں۔ وہ اس راز سے ناواقف تھا کہ انہی وٹامنوں کے ذریعہ اس کی زندگی میں توازن پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تمام امراض کے تدارک اور علاج کا سرچشمہ یہی قدرتی حقیقت ہے کہ اس دنیا میں ہر درد کے ساتھ اس کا درماں بھی موجود ہے۔

کائنات میں توازن، کنٹرول اور موجودات کے ضروریات کا لحاظ بتارہا ہے کہ ان کی نگرانی کوئی مدبر اور دانشمند ذات کررہی ہے جس نے اس نظام زندگی کا محافظ اسی توازن اور کنٹرول کو قرار دے دیا ہے۔

(جاری۔۔۔۔۔)